محمد شفیع بلوچ

زوالِ اُمتِ مسلمہ

(خانہ ویران سازیِ حیرت، تماشا کیجیے)

گردشِ ایام ایک اٹل اور لازوال حقیقت ہے جو قوموں اور ملتوں، جماعتوں اور لوگوں کے درمیان ہمیشہ جاری و ساری رہا کرتی ہے۔ اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا جیسا کہ قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَ تِلْکَ الاَیَّامُ نُداوِلُھَا بَیْنَ النَّاس. (۳:۱۴۰)

(یہ تو گردشِ ایام ہے جسے ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔)

قوموں کا عروج و زوال افراد کی صلاحیت اور نااہلی سے وابستہ ہوتا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں قوم کا زوال کس تاریخ سے شروع ہوا۔ سب کو اس کی خبر اس وقت ہوتی ہے جب وہ زور پکڑ جاتا ہے۔ معراجِ کمال تک پہنچنے میں ہر قوم کو ایک طویل زمانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انحطاط میں سب سے زیادہ مؤثر سبب اس کے نظامِ اخلاق کا انحطاط ہے۔[۱]

ہم کسی ملک یا قوم کے عروج و زوال کا جائزہ لیتے وقت تاریخی اعتبار سے جنگ کے میدانوں میں اس کی فتوحات اور شکستوں کو دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں: درحال آں کہ جب کوئی قوم اپنی تہذیب اور اپنی عملی روایات پر یقین نہیں رکھتی، اپنی عقل کو دوسروں کے افکار کی زنجیر میں گرفتار کرتی اور اپنی تمناؤں کو دوسروں سے مستعار لینے میں تأمل نہیں کرتی ہے تو پھر وہ نیابتِ الٰہی کے حق سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال میں Ideology کا

بھی بڑا عنصر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایمان، عملِ صالح اور علم، یہی اقانیمِ ثلاثہ ہیں جن کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں اور جن کی عدم موجودگی میں قوموں کا زوال لازمی ہے۔ ول ڈیورانٹ (Will Durant) لکھتا ہے:

''جب کسی قوم یا تمدن کا زوال ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اس قوم یا تمدن کی طبعی عمر کا اختتام ہو گیا ہے، بلکہ یہ زوال تو اس معاشرے کے سیاسی یا ذہنی رہنماؤں کے بدلے ہوئے حالات کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں ناکامی کا نتیجہ ہوتا ہے۔''[۲]

زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جب کوئی قوم تہذیب وتمدن کے زیور اور نفوذ وقوت کے ہتھیار سے مسلح ہو جاتی ہے اور اس کو اپنی ہمسایہ قوم کے حملے کا خطرہ نہیں رہتا تو وہ نہایت عیش وطرب کے ساتھ جو دولت کا لازمی نتیجہ ہے، زندگی بسر کرنے لگتی ہے، اس لیے اس کے تمام فوجی محاسن برباد ہو جاتے ہیں، تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ہر شخص کے دل میں خودغرضی اپنا قدم جما لیتی ہے اور اس کا مطمحِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ جو مال و دولت اس کے ہاتھ آئے، اس سے نہایت سرعت کے ساتھ ذاتی فائدہ اُٹھائے۔ اِس بنا پر تمام قوم عام مصالح سے اعراض کرنے لگتی ہے اور قوم کے وہ تمام اخلاقی محاسن فنا ہو جاتے ہیں جو اس کی عظمت کا حقیقی سبب تھے۔ اب اس پر قرب و جوار کی وحشی یا نیم وحشی قوموں کا حملہ شروع ہو جاتا ہے کیوں کہ تمدنی حیثیت سے اگرچہ وہ اس کی ہم سری نہیں کر سکتیں لیکن ان کا اعتقاد اس سے بہت زیادہ قوی ہوتا ہے۔ حملہ کرنے کے بعد وہ اس کے تمدن کی بنیاد کو ڈھا دیتی ہیں اور اس کے کھنڈر پر دوسرے تمدن کی عمارت قائم کرتی ہیں۔[۳] یہی کچھ اسلامی تہذیب کے ساتھ بھی ہوا۔ انتہائی عروج کے بعد مسلمان کاہلی کا شکار ہو گئے اور رفتہ رفتہ اپنے تہذیبی ورثے اور عظیم روایات سے محروم ہوتے چلے گئے۔ عالمگیر جذبۂ اخوت سے سرشار، رنگ ونسل کے امتیاز سے بے نیاز، معاشرتی عدل کے شعور اور ہمہ گیر مساوات کی قدروں سے لیس، طبقاتی اور اقتصادی ناہمواریوں سے مبرا مسلمان ان اوصاف کی بدولت تمام دُنیا پر چھا گئے اور انہی کو ترک کیا تو آسانی سے دُنیا کے ہاتھوں روندے گئے۔

بارہویں صدی عیسوی سے قبل مشرق کے علمی حلقوں میں مسلمانوں کے قدم ایشیا اور یورپ دونوں سے بہت آگے تھے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس وقت دُنیائے انسانیت کے علمبردار تھے لیکن اس کے بعد ان کا یہ تفوق مغربی دُنیا کو منتقل ہونا شروع ہوا، گو اس کی تکمیل نشاۃِ ثانیہ سے پہلے نہیں ہوسکی، جب مغربی علوم نے بتدریج غیر مذہبی رنگ اختیار کیا۔ سولہویں صدی کے آخر تک مشرقی تہذیب وتمدن کا قدم جہاں تھا وہیں رہا بلکہ اس میں روز افزوں انحطاط اور فرسودگی کے آثار پیدا ہوتے گئے، برعکس اس کے مغربی علوم کی رفتارِ ترقی نہایت تیزی سے بڑھنے لگی۔

عربوں کو جو دو ناکامیاں ہوئیں، ایک تو قسطنطنیہ کے محاذ پر اور دوسری فرانس میں، انہوں نے دُنیا کی ترقی کو صدیوں کے لیے روک دیا۔ اگر عربوں کو مالِ غنیمت سمیٹنے کی نہ پڑ گئی ہوتی اور اُن کا آپس میں اتفاق رہتا اور اگر وہ چارلس مارٹل (Charles Martel) کے وحشی لشکر کو مار بھگاتے تو دُنیا کی تاریخ کے تاریک ترین دور کی داستان کبھی نہ لکھی جاتی۔ تحریک احیائے علوم، تہذیب کی بحالی، عقل وفکر کی آزادی، یہ سب چیزیں جس وقت ظہور میں آئیں، اُس سے کئی صدیاں پہلے آ گئی ہوتیں۔[۴] سب سے اہم بات تو یہ ہوئی کہ ہسپانیہ، جو کسی زمانے میں علم وفن کا ملجا وماویٰ تھا، صدیوں کی گراں بہا میراث کھو کر ذہنی اعتبار سے ایسا ویران نہ ہو جاتا جیسا وہ اب ہے۔ کون ہے جسے اس عالی ظرف قوم کے انجام کا حال پڑھ کر قلق نہ ہوا، جسے عیسائی بادشاہوں کے مجنونانہ تعصب نے اس وطنِ مالوف سے دیس نکالا دیا جسے اس نے اقوامِ عالم میں ممتاز کر دیا تھا۔ کسی نے کیسے منصفانہ طور پر کہا ہے کہ ''وہ ایک منحوس گھڑی تھی جب غرناطہ کے میناروں پر صلیب نے ہلال کی جگہ لے لی۔'' ابنِ رشد، ابنِ باجہ اور عائشہ اور دوسرے رفتگانِ بزرگ کی روحیں اپنی قوم کی بنائی ہوئی عالی شان عمارتوں کے کھنڈروں میں بیٹھی رو رہی ہوں گی، جہاں اب نہ وہ اگلی شاعری اور موسیقی کی محفلیں ہیں، نہ وہ سپاہ گری کے کرتب، نہ وہ علم و دانش کی درس و تدریس اور جہاں اگر اب کوئی آواز سنائی دیتی ہے تو صرف مذہبی مناظروں اور سیاسی مجادلوں کے شور وغل کی گونج۔ عیسائیت نے اُن مسلم اندلسیوں کے نام

لیواؤں کو نکال کر صحرا میں دھکیل دیا اور جو خوبصورت سرزمین اُن سے چھینی اس کا تمام عرقِ زندگی نچوڑ کر اسے ایک ذہنی و اخلاقی صحرا بنا دیا۔'' [۵]

مسلمانوں کے سقوط و انحطاط کی داستان بہت طویل ہے۔ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا آغاز گیارہویں صدی عیسوی میں ہوا جب عالمِ اسلام میں اضمحلال پیدا ہوا۔ اس صدی کے اواخر میں عالمِ اسلام پر دھاوا بولا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے تو جہاد ختم ہو چکا تھا مگر عیسائیوں کی صلیبی جنگیں اب شروع ہو رہی تھی۔ عیسائی اس بات کو نہیں بھولے تھے کہ مسلمانوں کی سلطنت کا ایک حصہ ان علاقوں پر مشتمل ہے جو کسی زمانے میں عیسائی علاقے تھے اور ان میں وہ مقدس سرزمین بھی شامل ہے جہاں عیسائی مذہب نے جنم لیا تھا۔ عیسائیوں کو جوابی حملے کا حوصلہ اس لیے بھی ہوا کہ مسلمان اختلاف و افتراق کا شکار تھے اور اُن کی کمزوری سب پر عیاں ہو چکی تھی، چنانچہ شام و فلسطین میں صلیبیوں نے اپنی چار لاطینی سلطنتیں قائم کر لیں۔ مصر و افریقہ کو بھی فتح کرنے کے لیے یورشیں ہونے لگیں۔ سپین کو عملاً مغرب نے اپنا باجگزار بنا لیا۔ مکمل دو صدیوں تک لاطینی تسلط مسلم ممالک پر قائم رہا، پھر جب یہ تسلط ختم ہوتا نظر آیا تو کلیسا نے صلیبی مقاصد منگولوں کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی۔

متوکل عباسی کے دورِ حکومت میں رجعت پسند ملا برسرِ اقتدار آ گئے اور انہوں نے سائنسی علوم کا گلا گھونٹ دیا اور سائنس دانوں اور فلاسفہ کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان حالات میں قدرۃً عرب سائنس دان اپنے تجربات سے اخذ کیے ہوئے نظریات کا اظہار نہ کر سکے اور سائنس کو سخت دھچکا لگا۔ ابنِ خلدون اور ابنِ رشد کے انقلابی افکار بھی دُنیائے اسلام میں فروغ نہ پا سکے اور مغرب کو منتقل ہو گئے۔ ابنِ خلدون کی باریک بین نگاہوں نے یورپ میں اُبھرتی ہوئی نشاۃِ ثانیہ کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اپنے مقدمے میں لکھتا ہے کہ تاریک دماغ فقہا کی تعدی کے باعث دُنیائے اسلام میں علمی تحقیق کا بازار سرد پڑ گیا ہے جب کہ مغرب میں تحصیلِ علوم کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں اجتہاد کا اصول رائج تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بند ہو گیا اور

یہ تصور کر لیا گیا کہ تمام اشکال رفع ہو گئی ہیں۔ اجتہاد اور آزادانہ رائے نے مسلمانوں سے کیسے بڑے بڑے کام کرائے تھے۔ اس زمانے میں سائنسی دریافتوں اور سائنسی سرگرمیوں کا کتنا بڑا خزانہ سامنے آیا تھا۔ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی سائنسی علوم کی تحقیق اور تخلیقی کاموں کی رفتار سست پڑ گئی اور صرف نقل ہی باقی رہ گئی۔

ہسپانیہ میں عیسائیت نے لوگوں کی ذہنی زندگی تلف کر دی۔ مسلمانوں نے ہسپانیہ کو ایک باغ بنا دیا تھا، عیسائیوں نے اسے ایک صحرا میں تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں نے ملک کے چپے چپے پر مدرسے اور دارالعلوم قائم کیے تھے۔ عیسائیوں نے انہیں مقدس شخصیتوں اور بتوں کی پوجا کے لیے گرجوں میں تبدیل کر دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے علم و سائنس کے جو ذخیرے جمع کیے تھے، عیسائیوں نے انہیں جلا کر راکھ کر دیا۔ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے چن چن کر ذبح کیے گئے یا زندہ جلا دیے گئے۔ جو تھوڑے سے بچ گئے انہیں غلام بنا لیا گیا، جو بچ کر بھاگ نکلے وہ افریقہ کے ساحلوں پر جا جا کر بے خانماں فقیروں کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ہسپانیہ کے عیسائیوں نے اندلسی مسلمانوں پر جو مظالم توڑے انہیں فراموش یا معاف کرانے کے لیے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ دونوں کا مشترک عفو و رحم درکار ہوگا۔[۶]

مغربی افریقہ میں تیسرے الموحد حکمران کے دورِ حکومت میں ملائیت نے جو زور پکڑا اور بربروں نے جو مذہبی جوش دکھایا ان دونوں نے مل کر ترقی کے دھارے کا رُخ پلٹ دیا، صدیوں سے آگے بڑھتی ہوئی تہذیب کے قدم روک لیے اور علوم و فنون کے مرکزوں کو تعصب اور جہالت کے مراکز بنا دیا--- ایشیا میں خاندانِ تیموری کے زوال اور غیر متمدن اور متعصب اُزبکوں کے تیموری دارالحکومت پر قابض ہونے نے لوگوں کی ذہنی طاقتوں کو تلف کر دیا۔ ایران میں صفویوں کے تحت سائنس اور ادب میں نئے سرے سے جان پڑ گئی لیکن یہ نشاۃِ ثانیہ محض عارضی ثابت ہوئی۔ غزنویوں نے بہت جلد اس کا خاتمہ کر دیا۔ وسطی ایشیا نے ان بدقسمت ملکوں پر ایک مردنی سی چھائی ہوئی تھی--- عثمانی قلمرو میں سلیم اوّل، سلیمان اور مرادین کے ماتحت علم کی قدر ہوئی لیکن عثمانی بحیثیت مجموعی فوجی لوگ تھے، پہلے تو اپنے فاتحانہ عزائم پورے کرنے

کے لیے لیکن بعد میں مجبوراً اور اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے وہ ایک ایسے بے پناہ دشمن سے برسرِ پیکار تھے جس کی فتنہ پردازی کی کوئی حد نہ تھی۔[۷] ان تمام وجوہ سے بڑھ کر عالمِ اسلام ایک ایسے عظیم سانحے سے دوچار ہوا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ منگول قہرِ الٰہی بن کر عالمِ اسلام پر ٹوٹ پڑے۔ وہ موروملخ کی طرح مشرق سے بڑھے اور سارے عالمِ اسلام پہ چھا گئے۔ یہ یورش عالمِ اسلام کے لیے ایک بلائے عظیم تھی، جس سے دُنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں۔ مسلمان مبہوت و ششدر تھے۔ ایک سرے سے دوسرے تک ایک ہراس و یاس کا عالم طاری تھا۔ ایک مرتبہ تقریباً سارا عالمِ اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنۂ جہاں سوز کی لپیٹ میں آ گیا۔ صرف مصر میں مملوک سلطانوں نے اپنے قدم جمائے رکھے اور برِاعظم افریقہ میں منگولوں کی پیش قدمی کو روکے رکھا۔

مسلم معاشرہ اُس وقت جس درماندگی سے دوچار تھا، اُس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب چنگیز خان رے شہر میں پہنچا تو اُس وقت یہ شہر دو فریقوں میں منقسم تھا۔ ایک شافعی اور دوسرے حنفی۔ اوّل الذکر نے فوراً منگولوں کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کر لیا کہ وہ رات کو شہر اُن کے حوالے کر دیں گے بشرطیکہ منگول حنفی فرقے کے افراد کو تہِ تیغ کر دیں۔ منگولوں کو خون بہانے میں کبھی تأمل نہیں ہوا تھا چنانچہ اُنہوں نے بخوشی یہ پیش کش قبول کر لی اور جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو پھر کیا شافعی اور کیا حنفی، سب کو بے دریغ قتل کر دیا گیا۔

۶۵۶ھ میں تاتاری دارالخلافہ بغداد میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مؤرخ ابنِ کثیر بغداد کی تباہی اور تاتاریوں کی غارت گری و خون آشامی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

''یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ مَیں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں۔ اب بھی بڑے تکلّف و تردّد کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبرِ موت سننا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلّت و رسوائی کی داستان سنائے؟ کاش میں نہ پیدا ہوتا۔ کاش مَیں اس واقعہ سے پہلے مر

چکا ہوتا اور بھولا بسرا ہو جاتا--- یہ وہ حادثۂ عظمیٰ اور مصیبت کبریٰ ہے کہ دُنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے۔ اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دُنیا میں نہیں پیش آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ تاریخ میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا اور شاید دُنیا قیامت تک (یاجوج و ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے۔ ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا۔ انہوں نے عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا۔ عورتوں کے پیٹ چاک کیے اور پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا۔ یہ حادثہ عالمگیر و عالم آشوب تھا۔ ایک طوفان کی طرح اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے عالم پر پھیل گیا۔'' [۸]

وہ مزید لکھتا ہے:

''بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ چالیس دن کے بعد یہ گلزار شہر جو دُنیا کا پُر رونق ترین شہر تھا، ایسا ویران و تاراج ہو گیا کہ تھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے۔ بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے۔ ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں اور سارے شہر میں تعفن پھیلا جس سے شہر کی ہوا خراب ہوئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملکِ شام تک پہنچا۔ اس ہوا اور وبا سے بکثرت مخلوق مری، گرانی، وبا اور فنا، تینوں کا دور دورہ تھا۔'' [۹]

دُنیائے اسلام اس وحشت ناک صدمے سے بدحواس ہوگئی۔ مسلمان اور عیسائی دونوں ان وحشی حملہ آوروں کے خوف سے یکساں لرزہ براندام تھے۔ یہ حملہ قنطوروں (ایک اساطیری جانور جس کا جسم گھوڑے کا اور گردن کی جگہ آدمی کا بالائی حصہ ہوتا ہے) کی طرح اپنے گھوڑوں پر سوار، ہر طرف آتش زدگی و غارت گری کا طوفان برپا کر رہے تھے اور ہزار ہا نہتے شہریوں کو موت کے گھاٹ اُتار رہے تھے۔ تاتاریوں نے جو تباہی مچائی وہ انتہائی ہولناک تھی اور جو قتلِ عام کیا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ شہروں کو صرف تاخت و تاراج ہی نہیں کیا بلکہ انہیں ڈھا کر ملیامیٹ کر دیا۔ بے بہا فنی خزانے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ کھنڈرات ظروف سفالین کے

ریزوں سے پٹے پڑے تھے، کتب خانے یا تو جلا دیئے گئے یا ان کی کتابوں کو پھاڑ کر فاتحوں کے گھوڑوں کے لیے بستر تیار کیے گئے۔[۱۰] اس حملے سے عالمِ اسلام کو ایسا دھچکا لگا تھا کہ اس کے سنبھلنے کے لیے مدت درکار تھی۔ تاتاری حملے ہی سے مسلمانوں کے قوائے فکریہ میں اضمحلال اور افسردگی اور طبیعتوں میں یاس انگیزی اور جمود پیدا ہوگیا۔ اس حملے سے علومِ دینیہ، ادب و شاعری، تصنیف و تالیف اور اخلاقی و معاشرت سب پر اثر پڑا۔ سقوطِ بغداد پر سعدیؒ کا نوحہ فارسی ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ شاعر کی تصویر کشی کا اندازہ ان دو شعروں سے ہوسکتا ہے جن میں وہ بھیانک مناظر جھلک رہے ہیں جو اس نے خود ملاحظہ کیے تھے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین
اے محمدؐ! گر قیامت سر براں آری ز خاک
سر بروں آرد قیامت درمیانِ خلق بیں

ایک نیم وحشی، بُت پرست قوم کا عالمِ اسلام کے علمی و تہذیبی مرکز پر قابض ہو جانا ایک انتہائی افسوسناک واقعہ تھا جس کا پورے عالمِ اسلام اور پوری زندگی اور تمدن اور اخلاق پر اثر پڑا۔ انسانیت اور تہذیب کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ دُنیا کی زمامِ قیادت ان وحشی قوموں کے ہاتھ میں آ گئی جو نہ کوئی آسمانی دین رکھتے تھے اور نہ کسی علم و تہذیب اور تمدن کے سرمایہ کے مالک تھے۔ ان کی قیادت میں کسی علمی و دینی ترقی کی کوئی اُمید نہیں کی جاسکتی تھی۔

عالمِ اسلام میں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو ان کو عراق سے بے دخل کر سکے۔ اُدھر اہلِ مغرب نے مشرق کے میدان میں اسلام کو ناکامی سے دوچار کرنے کے لیے حکمتِ عملی کا حربہ استعمال کیا۔ منگولوں کو مسیحیت کی طرف راغب کرنے کی سرتوڑ کوششیں کی گئیں تاکہ اسلام کی قسمت کا آخری فیصلہ کرنے کے لیے اُن کا تعاون حاصل کیا جاسکے۔ لیکن اس صدی کے اختتام کے قریب اس اُمید کا بھی خاتمہ ہوگیا اور یہ توقع خاک میں مل گئی کہ منگول ایک کثیر تعداد میں عیسائیت قبول کرلیں گے بلکہ حالات نے غیر متوقع طور پر دوسرا ہی رُخ اختیار کرلیا۔ اس وقت

اسلام کی روحانی طاقت اور قوتِ تسخیر کا ایک معجزہ ظاہر ہوا اور چند گمنام اور مخلص داعیوں اور مسلمان امراءِ دربار کی کوششوں سے تاتاری امرا و سلاطین میں اسلام کی اشاعت شروع ہوگئی۔ منگول عیسائی ہونے کے بجائے ۱۳۱۶ھ میں حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔ سب سے پہلے تقدر (احمد) خان (۱۲۸۲ء-۱۸۲۴ء)[۱۱] اور غازن خان (۱۲۹۵ء-۱۳۰۴ء) نے اسلام قبول کیا۔ ایران میں غازن خان کے ورثا بھی اسی دین پر قائم رہے اور اس طرح اسلام نے ایک ناقابلِ تسخیر قوم کو فتح کرلیا جس نے سارے عالمِ اسلام کو ایک بار فتح کرلیا تھا۔ ابنِ کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:

''اس سال چنگیز خان کا پڑپوتا قازان تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور امیر توزونؒ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف بہ اسلام ہوا اور تاتاری کُل یا بیش تر اسلام میں داخل ہوگئے۔ جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سروں پر نچھاور کیے گئے۔ اُس نے اپنا نام محمود رکھا اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی۔ بہت سے بت خانے گرا دیئے اور ان پر جزیہ مقرر کیا۔ بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں اور انصاف کیا گیا اور لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں دیکھیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کا شکریہ ادا کیا۔''[۱۲]

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
(علامہ اقبالؒ)

ان کے اسلام قبول کرلینے کے بعد اگرچہ مسلمان ان کی غارت گری اور خوں آشامی سے محفوظ ہوگئے تھے اور ان کو دینی آزادی حاصل ہوگئی تھی اور اسلام حکمران طبقہ کا مذہب بن گیا تھا، مگر جدید الاسلام تاتاریوں میں بہرحال دینی و علمی قیادت اور اسلامی امامت کی صلاحیت نہ تھی۔''[۱۳]

بغداد کو زوال آیا لیکن اَندلس ابھی اُمیدوں کا مرکز تھا۔ وہاں سائنسی علوم کی تعلیم

جاری رہی مگر سقوط اندلس نے گویا مسلمانوں کی اس علمی فضیلت کی بساط اُلٹ کر رکھ دی۔ سقوط غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد مسلمان وہاں سے نکل کر متفرق و منتشر ہو گئے اور وہاں کے علما اور سائنس داں اسپین سے نکل کر باہر جانے لگے۔ اس وقت ترکی میں طاقت ور مسلم خلافت (۱۳۰۰ء-۱۹۲۴ء) قائم تھی۔ اس زمانے میں غالباً کچھ مسلم سائنس داں بھاگ کر ترکی گئے مگر وہاں کے دربار میں انہیں کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ مسلم اسپین کے زوال کے بعد ۱۵۲۶ء میں ہندوستان میں مغل سلطنت قائم ہوئی مگر مغل حکمرانوں کو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ قدیم مسلم اسپین کے کچھ سائنس دانوں کو بلائیں اور علمی ترقی کا وہ کام ہندوستان میں جاری کریں جس کا سلسلہ اسپین میں منقطع ہو گیا تھا۔[۱۴] دوسری طرف صقلیہ کی باری آئی تو نارمنوں نے ۱۰۷۱ء میں اس کے پایۂ تخت پر قبضہ کر لیا اور پھر ۱۰۸۱ء تک پورا سسلی چھین لیا گیا پھر بارہویں صدی میں نارمن حملے افریقہ پر ہونے لگے، بحرِ روم میں طاقت کا توازن درہم برہم ہو گیا اور اسی صدی کے اواخر تک بحرِ روم پر نارمنوں اور اطالیوں کی برتری قائم ہو گئی۔

تیرھویں صدی عیسوی میں عالمِ اسلام ایک خستہ و شکستہ تعمیر کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے اپنی مدتِ حیات کی سات صدیوں میں اگرچہ کئی ایک طوفانوں کا مقابلہ کیا تھا لیکن اب یہ ایک ایسے مرحلے پر آن پہنچا تھا جبکہ اس کی اندرونی قوت کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ اُس وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا بھی اُسے سرزمین سے بیخ و بُن سمیت بآسانی اُکھاڑ پھینک سکتا تھا جہاں اس کا وجود اب تشویش ناک حالت میں تھا۔ تاریخ کی یہ ایک متناقض حقیقت ہے کہ جب اسلام کا نور دور دراز خطوں میں روشنی پھیلا رہا تھا، اسلام کے پیروکار خود اسلامی سلطنت کے مرکز میں بیٹھے اپنے عظیم نصب العین سے پہلو تہی کر رہے تھے۔[۱۵]

پندرہویں صدی کے آتے آتے مسلمان خانہ جنگیوں، ابتذال و کشمکش، مجاہدوں، مناظروں، آفات اور یلغاروں کا شکار ہو رہے تھے۔ چنانچہ عین اس وقت جب کہ یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کی لہر دوڑ رہی تھی، مسلمان اپنے عہدِ زرّیں کا تختہ اُلٹ کر عہدِ جاہلیت کی طرف لوٹنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس زمانے میں جب ایشیا، مشرقی یورپ اور شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی شان و شوکت کا سورج نصف النہار پر تھا، مغربی یورپ سے ان کی حاکمیت کا ستارہ غروب ہو گیا۔ گیارہویں اور پندرہویں صدی کے درمیان اٹلی، پرتگال اور ہسپانیہ سے مسلمانوں کی پسپائی اور عیسائیوں کی فتح سے مسلمانوں کی وسیع آزادی عیسائی حکومت کے ماتحت آ گئی، یہ آبادی ایک زمانے سے وہاں موجود تھی۔ ان تمام ملکوں میں عیسائیوں نے اپنی فتح کے بعد ایک منصوبے کے تحت مسلمانوں کو عیسائی بنانا شروع کیا اور جو عیسائی نہیں بنے، انہیں ترکِ وطن پر مجبور کیا یا مار ڈالا۔ وقفے وقفے سے ایسے زمانے بھی آئے جب مسلمانوں کو کسی حد تک برداشت کیا گیا لیکن عام طور پر عیسائیوں کی پالیسی یہی تھی۔ اس کوشش میں آخرکار عیسائی کامیاب ہو گئے۔[۱۶] شروع میں مسلمان عیسائیت کے غلبے کو اپنے لیے کوئی اتنا زیادہ خطرہ نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ برنارڈ لیوس کا بھی خیال ہے:

''عمومی طور پر مسلمان عیسائیت کو اسلام کے لیے مذہبی طور پر خطرہ نہیں سمجھ رہے تھے، اسے مذہبِ اسلام کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا جا رہا تھا۔ ان کے نزدیک یہ خیال نہایت احمقانہ تھا کہ مسلمان اسلام سے پہلے کے کسی مذہب کو قبول کر لیں گے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اپنی مرضی سے عیسائی مذہب قبول کرنے والے مسلمان بہت ہی کم تھے۔''[۱۷]

سولہویں صدی عیسوی عالمی تاریخ میں عجیب و غریب اہمیت کی حامل ہے۔ یہ صدی دُنیا کے صرف دو مذاہب اسلام اور عیسائیت کے پھیلاؤ، باہمی تصادم، ایک دوسرے سے گریز اور الگ الگ راہوں اور منطقوں کی طرف مڑنے اور اپنی صلاحیتوں کو ان کی طرف منعطف کرنے کی صدی ہے۔ اس میں زیادہ تر دُنیا کے دو برِاعظم یعنی ایشیا اور یورپ باہم مسابقوں اور مقابلوں میں مصروف نظر آنے لگے تھے۔ ایشیا مسلمانوں کا برِاعظم اور یورپ عیسائیوں کا برِاعظم۔ افریقہ کا صرف شمالی حصہ تگ و دو میں شریک ہے اور یہ حصہ افتاد اور مزاج کے اعتبار سے افریقی سے زیادہ ایشیائی خدوخال کا حامل ہے۔ مشرقی یورپ میں اسلامی ایشیائی اثرات غلبہ حاصل کرتے چلے گئے اور مغربی یورپ میں یہی اثرات مغلوب ہوتے ہوتے معدوم ہوتے

گئے۔

سولہویں صدی عیسوی کا زمانہ مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت کا آخری زمانہ ثابت ہوا اور اہلِ یورپ کے اعزاز کا یہی اوّلیں دور ہے۔ مغرب کو بیداری کے بعد سیاسی، عسکری، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ہر میدان میں مسلسل تفوّق اور بالادستی حاصل ہوتی چلی جارہی تھی اور اس کی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ مغرب نے اسلامی دُنیا کو کس طرح اپنے نرغے میں لیا، اس کی تفصیل ٹائن بی یوں بیان کرتا ہے:

''عربوں نے ساحلِ اوقیانوس کے ساتھ ساتھ جو بحری محاذ قائم کر رکھا تھا، پرتگیزوں نے اس کے بازو میں راستہ پیدا کرلیا اور وہ آگے بڑھتے بڑھتے ۱۴۴۵ء میں راس ورد Cape (Verede، یہ سینی گال کی ایک راس ہے، اس کے سامنے اس نام کا ایک جزیرہ بھی ہے) کے پاس سے ہوتے ہوئے نکل گئے۔ ۱۴۷۱ء میں وہ خطِ استوا پر تھے، ۸۸-۱۴۸۷ء میں راس اُمید کا چکر لگایا، ۱۴۹۸ء میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ میں لنگر انداز ہوئے۔ ان کی پیش قدمی بدستور جاری رہی۔ ۱۵۱۱ء میں اُنہوں نے آبنائے ملکا (Malacca: یہ آبنائے ملایا اور سماٹرا کے درمیان واقع ہے، اسی میں سے ہوکر سنگاپور جاتے ہیں اور وہاں سے بحرالکاہل میں داخل ہوتے ہیں) پر تسلّط جمایا۔ ۱۵۱۶ء میں بحرالکاہل کے مغربی حصے تک رسائی حاصل کر لی اور اپنے پرچم کی نمائش کانٹن میں کی۔ ۴۳-۱۵۴۲ء میں وہ جاپان کے ساحل پر نمودار ہوئے، گویا پرتگیزوں نے شہابِ ثاقب کی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے بڑھتے بحرِ ہند کی حکمرانی عربوں سے چھین لی۔

جس زمانے میں مشرقی جانب بحر پیمائی کرنے والے پرتگیزوں نے مغربی دُنیا کے لیے وسیع سمندروں پر حکومت حاصل کر لی تھی اور جنوبی سمت میں عربی اسلامی دُنیا کا بازو نرغے میں لے لیا تھا، اس زمانے میں کشتی رانی کے ذریعے سے مشرقی جانب پیش قدمی کرنے والے ''کاسکوں'' نے اچانک اور انتہائی تیزی سے روسی دُنیا کی حدیں بڑھا کر ایرانی اسلامی دُنیا کو شمالی سمت سے گھیرے میں لے لیا۔ پیش قدمی کے اس راستے کو کھولنے کا ذمہ دار ماسکو کا زار آئی

ون چہارم (Ivan-IV۔ روس کا پہلا زار جسے خوفناک بھی کہتے ہیں۔ ۱۵۳۰ء تا ۱۵۸۴ء) جس نے ۱۵۵۲ء میں قازان کو مسخر کیا۔ قازان شمالی و مشرقی سمت میں ایرانی اسلامی دُنیا کا آخری حصار تھا، اس کے مسخر ہوتے ہی جنگلات اور برف باری کے سوا کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی، جنگلات اور برف باری خانہ بدوش کاسک جنگ جوؤں کے پرانے رفیق تھے۔ چنانچہ روسی آرتھوڈکس مسیحیت کے یہ علمبردار پیش قدمی کرتے کرتے کوہستانی یورال سے گزرے، پھر سائبیریا کے آبی راستوں کے ساتھ ساتھ ۱۶۳۸ء میں بحرالکاہل پر اور ۲۴ مارچ ۱۶۵۲ء کو مانچو سلطنت کی شمالی و مشرقی سرحد پر پہنچ گئے۔ یوں روسی سلطنت دُنیا میں اس درجے پھیلی کہ اس نے نہ صرف ایرانی دُنیا کا بازو روک لیا بلکہ وہ یوریشیا کی پوری سطح مرتفع پر قابض ہوگئی۔ اس طرح ایک صدی سے کچھ کم ہی مدت میں اسلامی دُنیا جس کے اندر عربی اور ایرانی معاشرے باہم مل گئے تھے، کاملاً نرغے میں آ گئی۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں پھانسی کا پھندا شکار کی گردن میں پوری طرح پڑ چکا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اسلامی دُنیا یکایک ایک خوفناک خطرے میں مبتلا ہوگئی، تاہم خاصی لمبی مدت تک خود مسلمانوں یا ان کے حریفوں کو صورتِ حال کا کوئی احساس نہ ہوا۔ ورنہ وہ اپنے اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل پر پہنچانے کے لیے قدم اُٹھانے میں توقف نہ کرتے۔ نہ مغربی اور روسی سمت سے کسی نے بے بس شکار کو چھلانگ مار کر دبوچ لینے کی کوشش کی اور نہ مسلمانوں کی طرف سے اس بظاہر حد درجے ہولناک حالت سے بچ نکلنے کے لیے کوئی حرکت ہوئی۔'' [۱۸]

جب یورپ تیزی سے جارحیت کی جانب بڑھ رہا تھا، اُس وقت تاریخی اعتبار سے عالمِ اسلام ایک اہم غلطی کا مرتکب ہوا۔ وہ سولہویں اور سترہویں صدی کی ایک فعال اور ترقی یافتہ تہذیب کی حیثیت سے داخلی امور اور الجھنوں میں پھنسا رہا اور اس نے یورپ کی مسلسل ترقی اور ایک غالب طاقت کی حیثیت سے اُبھرنے کی طرف توجہ نہ کی۔ اور غفلت برتی۔ مسلمان اہلِ یورپ کو ایک تند خو جنگجو ٹولے سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اپنی مشہور عسکری عظمت پر وثوق و اطمینان اس درجہ راسخ ہو چکا تھا کہ جب صورتِ حال منقلب ہو

گئی اور ویانا کے دروازے پر انہوں نے شکست کھائی تو اس وقت بھی انہیں کوئی خاص خیال نہ ہوا۔ ایک سو سال بعد مسلمانوں کی عسکریت کا زوال زیادہ سے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا۔ ۱۷۶۸ء میں روس اور سلطنتِ عثمانیہ کے درمیان جنگ چھڑی تو ترکوں کو بتایا گیا کہ روسیوں نے بحیرۂ بالٹک میں جو بیڑا تیار کیا ہے، اسے بحیرۂ روم کے راستے قسطنطنیہ لا رہے ہیں لیکن انہیں یقین نہ آیا کہ بحیرہ بالٹک سے بحیرۂ روم تک بحری راستہ موجود ہے۔ یہاں تک بیڑا سچ مچ آ پہنچا۔ تیس سال بعد وینس کے تاجروں نے مصر کے مملوک حاکم مراد بے کو بتایا کہ نپولین مالٹے پر قابض ہو چکا ہے، ممکن ہے اس کا مقصد یہ ہو کہ مصر پر یورش کرے۔ یہ سنا تو مراد بے نے اس مشورے کی لغویت پر ایک پُر زور قہقہہ لگایا۔ (حالانکہ نپولین نے نہ صرف حملہ کیا بلکہ وہ مملوکوں کو شکست دے کر مصر پر قابض بھی ہو گیا، اس طرح تمام یورپی قوموں پر مصر کی اہمیت پہلی مرتبہ واضح ہوئی۔)[۱۹]

ایک طرف تو مشرق کی یہ عظیم اسلامی تہذیب زوال پذیر تھی اور دوسری طرف مغرب اپنی نشاۃِ ثانیہ کے بعد عروج کی طرف گامزن تھا۔ مغرب نے جوں جوں ترقی کی راہیں طے کرنا شروع کیں، مشرق توں توں زوال پذیر ہوتا چلا گیا۔ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی ہی سے ترک تنزل و انحطاط، علمی پس ماندگی اور جمود کا شکار ہو چکے تھے۔ تاریخِ انسانی کا یہ وہ عظیم ترین عہد ہے جس کا اثر بعد کی صدیوں پر نقش ہے، یورپ اس میں اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا اور ایک جوش و جنوں کی حالت میں اُٹھ کر غفلت اور جہالت کے اس طویل زمانہ کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہر شعبۂ حیات میں گریز پا ترقی کر رہا تھا۔ طبعی قوتوں کو مسخر، کائنات کے اثرات--- کو منکشف اور نامعلوم سمندروں اور اقلیموں کو دریافت کر رہا تھا، ہر علم و فن میں اس کی فتوحات اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے اکتشافات جاری تھے۔ اس مختصر سی مدت میں اس کے یہاں ہر علم میں بڑے بڑے محقق، موجد اور مجتہدِ فن پیدا ہوئے۔ کوپرنیکس، برونو، گلیلیو، کیپلر اور نیوٹن وہ عالم اور محقق تھے جنہوں نے ہیئت اور طبیعیات کا ایک جدید نظام پیدا کر دیا۔ سیاحوں اور بحری جہاز رانوں میں کولمبس، واسکوڈی گاما اور میگلن جیسے عالی ہمت اولوالعزم پیدا ہوئے جنھوں نے

نئی دُنیا اور نامعلوم ممالک دریافت کیے۔[۲۰]

۱۷۰۰ء میں مسلمانوں کی چار اہم عالمی طاقتیں موجود تھیں: مملوکِ مصر، عثمانی ترکی، صفوی ایران اور مغل انڈیا۔ یورپی اقوام نے ۱۷۲۰ء کے قریب مغلوں کو اور پھر ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ مملوکوں کو شکست دے دی۔ ۱۷۲۳ء میں صفوی ختم ہو گئے، بس ایک سلطنتِ عثمانیہ بچی رہی جہاں سترھویں صدی میں اوّل سے آخر تک نااہل سلطانوں کا ایک سلسلہ بندھا ہوا نظر آتا ہے۔ ان میں جو عیش پرست نہیں تھے، وہ پرلے درجے کے ظالم و جابر تھے اور جو حرم کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ انتہا سے زیادہ بداطوار تھے۔ ان کی منظورِ نظر بیگمات سلطنت کے بڑے بڑے عہدے فروخت کرنے لگیں۔ ترکی زبان میں ایک کہاوت ہے 'مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے'۔ حرم اور بادشاہوں کا یہ رنگ دیکھ کر عمالِ عثمانی بھی اسی رنگ میں رنگے جانے لگے، یہاں تک کہ رشوت دے کر عہدے حاصل کرنا ایک معمولی بات ہو گئی۔ پہلے قابلیت ترقی کا معیار تھا مگر اب اس کی کوئی پرسش نہیں رہی۔ غرض یہ کہ جو سلاطین عثمانی مردانہ شجاعت و بہادری میں قدیم رومی بادشاہوں سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے، اب وہ بازنطینی حکمرانوں کی طرح آرام پسند اور تن آسان ہونے لگے۔ اس زمانے کا عثمانی قصرِ شاہی بازنطینی محل شاہی کا جواب تھا۔[۲۱]

سلطنتِ عثمانیہ (۱۴ویں صدی سے ۱۹۲۳ء تک) کا مرکز ترکی تھا اور ترک ہی اس کو کنٹرول کرتے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے تمام عربوں کے علاوہ یونانی، یوگوسلاوی، البانوی، رومانوی اور بلقان کے باشندے بھی سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں تھے۔ ۱۶۸۳ء میں سلطنتِ عثمانیہ کی افواج ویانا تک پہنچ گئی تھیں مگر اس پر قبضہ نہ کر سکیں۔ ۱۸۲۹ء میں برپا ہونے والے ایک انقلاب کے ذریعے یونان ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر روس، ترک جنگ (۷۸-۱۸۷۷ء) کے بعد برلن کانگریس (۱۸۷۸ء) میں قبرص، سربیا، مونٹی نیگرو اور رومانیہ بھی ترکوں کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ جنگِ بلقان (۱۳-۱۹۱۲ء) کے نتیجے میں سلطنتِ عثمانیہ نے قسطنطنیہ اور اردگرد کے ایک مختصر سے علاقے کے سوا تمام یورپی علاقے کھو دیے۔ بچی کھچی

سلطنت مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ تک محدود ہوگئی۔ یہ تقریباً پورا علاقہ کلیتہً مسلم آبادی پر مشتمل تھا۔ ۱۹۱۴ء میں سلطنتِ عثمانیہ نے جنگِ عظیم اوّل میں جرمنی کا ساتھ دیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے تھوڑے ہی عرصے بعد یہ سلطنت اور مسلم حکومت کی مرکزیت (خلافت) بھی مکمل طور پر ختم ہو گئی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی تک آتے آتے مسلم معاشرے کے دینی و اخلاقی انحطاط نے ان کے اندر وہ کمزوریاں پیدا کر دیں جو دُنیا میں عزت وعظمت کی نقیض ہیں اور ان کے جسدِ ملّت کو وہ بیماریاں لاحق ہوگئیں جو ان کی تعمیری صلاحیتوں کو چاٹ گئیں۔ چنانچہ ان کے اندر کاہلی، کام چوری، نااتفاقی، خودغرضی و بزدلی، قانون شکنی اور فقدانِ تنظیم ومنصوبہ بندی نے جنم لیا اور صحیح تعلیم وتربیت سے اغماض، تحقیق سے اعراض، کمزور ابلاغ اور سیاسی عدم استحکام نے انہیں معاشی وحربی طور پر کمزور کر دیا اور سماجی وسائنسی علوم میں پیش رفت سے وہ تہی دامن ہو گئے۔ مغرب کی حریف قوتیں اسی انتظار میں تھیں کہ کب یہ کمزور ہوں اور وہ انہیں دبوچیں۔ چنانچہ انہوں نے سازشیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں کو لڑا کر مزید کمزور کیا اور بتدریج مسلم ممالک پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔[۲۲] اسلامی دُنیا میں بے عملی اور بے حرکتی اور دُنیا فراموشی کے رجحانات کی پرورش ہوئی اور پوری اسلامی دُنیا ایک مفلوج کیفیت میں گرفتار ہوگئی اور کائنات کی تفہیم، کائنات کی تعمیر وتشکیل میں ایک عملی کردار اور جہاں گیری و جہاں داری سے بیگانہ ہو کر محکومی کے شکنجے میں پھنستی چلی گئی۔ عرب دُنیا کے مصنف نجلا عزالدین نے اس صورتِ حال کا تجزیہ یوں کیا ہے:

''جو عذاب یا وبال عربی معاشرے پر باہر سے نازل ہوئے ان سے بھی زیادہ تباہ کُن مصیبت یہ تھی کہ اس معاشرے کی اندرونی قوتِ تخلیق اور جوشِ مہمات سرد پڑ گیا۔ پُرجوش ذہنی شوقِ تجسّس جو عہد ماسبق کی خصوصیت بنا ہوا تھا اور اس کے ساتھ حوصلہ مندی کی مسرت، مذہبی عقائد اور مرکزیت کے سخت دباؤ سے گھٹ کر رہ گئی، آزاد خیالی کو دیس نکالا نصیب ہوا اور اس کی جگہ روایت پرستی حکومت کرنے لگی۔ صداقت کی بے روک ٹوک جستجو پر الحاد و بے دینی کی

مہر لگ گئی۔ اس سے پہلے عہد کے زیادہ بے باک اور جرأت مند اشخاص گوشۂ گمنامی میں جلاوطن کر دیئے گئے۔ لوگوں کے دماغ بجائے اس کے کہ اپنی صلاحیتوں کو علمیت کی نئی راہیں نکالنے کے کام میں لاتے، انہی مسائل کی شرحیں اور خلاصے تیار کرنے میں منہمک ہو گئے جو پہلے سے سب کو معلوم تھے۔" [۲۳]

اٹھارہویں صدی کے وسط تک ترکی یورپ کا مردِ بیمار، ایران وسطی ایشیا کا ایک کمزور ملک، مغل ہندوستان طوائف الملوکی کا شکار اور وسطِ ایشیا کا وسیع اسلامی خطہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ پھر یوں ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نہ صرف سب کچھ نکل گیا بلکہ وہ خود بھی سامراجی چنگل میں پھنس گئے۔ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ادھر عالمِ اسلام خستہ و نزار ہوا اور ادھر مغرب کا پرچمِ استعمار بلند ہوا۔ یہی صدی مسلمانوں کے باہمی نزاعات کی صدی بھی ہے۔ ان نزاعات کی تہہ میں فرقہ وارانہ تعصب کام کر رہا تھا۔ شیعہ سُنّی اختلافات جو اس سے کچھ پہلے تقریباً معدوم ہو چکے تھے، دوبارہ اُبھر کر زیادہ شدید صورت اختیار کر گئے۔ اس اختلافی صورت نے دو عظیم الشان مسلمان فرمانرواؤں، ترکی کے سلطان سلیم اوّل اور ایران کے صفوی بادشاہ اسماعیل اوّل کے درمیان بہت بڑا تصادم کرا دیا۔ یہ تصادم مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو مضمحل کرتا چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اجتماعی قوت باہر کی طرف پھیلنے کی بجائے اندر کی طرف سمٹتی گئی۔ [۲۴] کرد علی دولتِ عثمانیہ کے زوال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آلِ عثمان کے انحطاط کا ایک جوہری سبب یہ ہے کہ عیسائی باندیوں اور کنیزوں کی کثرت کی وجہ سے سلطانی خون بہت زیادہ بدل گیا تھا۔" [۲۵]

مسلمانوں کا تنزل صرف حکمت و علوم، نظریہ اور صنعت و حرفت میں ہی نہ تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اور عمومی انحطاط تھا جو مسلمانوں پر پورے طور پر محیط تھا، حتیٰ کہ وہ اپنے فنونِ جنگ میں بھی یورپ سے پیچھے رہ گئے، جن میں ترکوں کو درجۂ امامت و اجتہاد حاصل تھا اور ان میں ان کی فوقیت کا دُنیا کو اعتراف تھا لیکن یورپ اپنی ایجاد و اجتہاد اور تنظیم کی بدولت فنونِ حربیہ میں بھی ترکوں سے بہت بڑھ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوجوں نے ۱۷۷۴ء میں عثمانی افواج کو

شرمناک شکست دی اور دُنیا پر ظاہر ہوگیا کہ ترک جنگی طاقت میں یورپ کی عیسائی قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔[۲۶] برنالڈ لیوس بڑے فخر سے لکھتا ہے:

''پہلے عظیم جہاد کا جواب یورپ نے اپنے علاقوں کی بازیابی کی جنگ اور صلیبی جنگوں سے دیا تھا۔ اب مسلمانوں کی دوسری یلغار کا جواب یورپ نے اپنی توسیع پسندی سے دیا جو آخرکار سامراجی قوت کی شکل میں بدل گیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ یہ مہم یورپ کے دُور افتادہ علاقوں سے شروع ہوئی۔ ان ملکوں سے جو خود مسلمانوں کے زیرِ اقتدار رہے تھے، جیسے جزیرہ نمائے آئبیریا (سپین) کے ملک اور روس۔ یہ طوفان بڑھتا ہی چلا گیا، حتیٰ کہ اس نے پورے عالمِ اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔''[۲۷]

برِّاعظم یورپ میں صرف ایک مقام پر ایک مسلم مملکت یعنی سلطنتِ عثمانیہ نے زوال آمادہ ہونے کے باوجود بلقان، ایجین اور قسطنطنیہ کی طرف بڑھتی ہوئی عیسائی یورپ کی یلغار کو روکا۔ اس وقت مسلمانوں کی یہ سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت تھی، تاہم عثمانی ترک جہاں یورپ کا مقابلہ کر رہے تھے وہاں آہستہ آہستہ یورپ کے زیرِ اثر بھی آتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے یورپ کے بہت سے طور طریقے بھی اختیار کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ان تبدیلیوں نے مسلمانوں کو بادلِ نخواستہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے پر مجبور کر دیا۔[۲۸]

تُرکوں کے تنزل و انحطاط سے عالمگیر طاقت و اقتدار اور ذہنی و تہذیبی قیادت یورپ کی غیر مسلم قوموں کی طرف منتقل ہوگئی جنہوں نے عرصۂ دراز سے اس کی تیاری کی تھی اور جن کی کوئی حریف مساوی درجہ کی طاقت میدان میں نہ تھی۔ مغرب سے مشرق تک کوئی ملک ان کے اثر و نفوذ سے خارج نہ رہا۔ قومیں یا تو مادّی اور سیاسی حیثیت سے ان کی غلام اور زیرِ فرمان تھیں یا ذہنی، علمی اور تہذیبی حیثیت سے زیرِ اثر اور زیرِ اقتدار تھیں۔[۲۹] مغربی طاقتیں جو صدیوں سے مشرقِ وسطیٰ کی تسخیر کے خواب دیکھ رہی تھیں وہ جنگِ عظیم اوّل کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئیں۔ بچی کھچی عثمانی سلطنت جو مسلمانوں کے سیاسی اور حکومتی اتحاد کی علامت تھی، ۱۹۲۲ء میں ختم ہوگئی۔[۳۰] دو عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے میں بیشتر مسلم ممالک میں

نوآبادیاتی حکمرانی کو وسعت دی گئی اور اسے مضبوط کیا گیا۔ مسلمان مغربی دُنیا سے زیادہ واقف ہوتے گئے اور بیسویں صدی کی تہذیب کے الجھاووں سے ان کا واسطہ پڑا۔[۳۱] مسلمانوں کے نوآبادیاتی آقاؤں (برطانیہ، نیدرلینڈ، اٹلی، جرمنی اور فرانس) کو دوسری جنگِ عظیم نے کمزور کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی قوم پرستی پر مبنی آزادی کی تحریکیں مضبوط تر ہو گئی تھیں۔ فاتح اتحادیوں کے درمیان نااتفاقی اور اس کے بعد سرد جنگ نے بھی نوآبادیاتی نظام کے خاتمے میں خاصی مدد دی۔ آہستہ آہستہ تقریباً سارے ہی مسلمان ملک نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہو گئے۔ انڈونیشیا ۱۹۴۵ء میں آزاد ہوا، پاکستان ۱۹۴۷ء میں، نائجیر یا ۱۹۶۰ء میں، کویت ۱۹۶۱ء میں اور ملائشیا ۱۹۶۳ء میں۔[۳۲]

مسلمانوں کے زوال کے تناظر میں اگر بیسویں صدی کا جائزہ لیا جائے تو تیسری دہائی میں عثمانی خلافت کے سقوط سے شروع ہو کر صدی کے وسط میں فلسطین کے قلب میں اسرائیلی ریاست کا قیام، مسلم ممالک کی برطانوی اور دیگر مغربی استعمارات سے آزادی، مسجدِ اقصیٰ کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلنا، عربوں اور اسرائیل کے درمیان ہونے والی تین بڑی جنگیں، آزادیٔ فلسطین کے لیے جاری پچاس سالہ جدوجہد اور پھر آخری دہائی کے آغاز میں جنگِ خلیج اور آخر میں بوسنیا، کوسوا اور چیچنیا میں پیش آنے والے خونی واقعات تک دراز نظر آتا ہے۔ ان تمام واقعات میں فلسطین کے قلب میں اسرائیلی ریاست کا قیام تاریخ کا ایک عبرت ناک واقعہ ہے۔ ٹائن بی کا کہنا ہے کہ تاریخ جن عبرت ناک واقعات سے لبریز ہے، اُن میں سے کوئی واقعہ انسانی فطرت کی برائیوں پر ایسی روشنی نہیں ڈالتا جتنا کہ یہودیوں کی نئے نمونے کی قومیت ڈالتی ہے۔ یہودی نسل پر جو ظلم وستم ہوئے، اُن میں سے حد درجے خوفناک ترین ظلم و ستم کا تختہ مشق بننے کے ساتھ ہی انہوں نے فلسطینی عربوں کے مقاصد کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے، عربوں کا گناہ اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ فلسطین ان کا آبائی وطن تھا۔ یہودیوں نے نازیوں کے ہاتھوں جو مصیبتیں برداشت کیں، اُن سے صہیونیوں نے صرف ایک سبق حاصل کیا یعنی وہ اس جرم کے ارتکاب سے باز نہ رہ سکے جس کے ہدف خود بن چکے تھے۔ بلکہ

انہوں نے اپنے سے کمزور قوم پر بے تکلف ظلم وستم شروع کر دیئے۔ اسرائیلی یہودیوں نے اس حد تک تو نازیوں کی پیروی نہ کی کہ فلسطینی عربوں کو قیدیوں کے تادیبی کیمپوں اور گیس کی کارگاہوں میں بند کر کے بالکل ختم کر دیئے لیکن کم وبیش پانچ لاکھ آدمیوں سے وہ زمینیں چھین لیں جو ان کے آباواجداد کے زمانے سے ان کے قبضے میں چلی آ رہی تھیں اور جن میں وہ پشت ہاپشت سے کھیتی باڑی کر رہے تھے۔ بے چارے عربوں کو بھاگنا پڑا، وہ جائیدادیں اُٹھا کر ساتھ نہ لے جا سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملکیت سے بالکل محروم ہو گئے اور اب ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنے وطن سے باہر نکالے جا چکے ہیں۔[۳۳]

تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان اسلام کی روح اور اس کی حقیقی تعلیمات کے پابند رہے تو ایک پُرشکوہ تمدن کے مالک بن کر ترقی کی راہ پر گامزن رہے، لیکن جب ان کی شخصی اور اجتماعی زندگی بدلی تو تمدنِ اسلامی کا خورشید فروزاں بھی زوال کی طرف جانے لگا۔ وہ عظیم روایات جس کے مسلمان وارث اور مالک تھے، وہ مغربی اقوام نے اپنا لیں اور وہ افکار وعلوم کے ذریعے ساری دُنیا پر چھا گئے۔ مسلمانوں سے صداقت واخلاص اور بلندیٔ اخلاق کی روایات کیا چھوٹیں کہ وہ غبارِ کارواں بن کے رہ گئے۔ بہ ایں ہمہ وہ اپنے زوال کو مان کے نہیں دے رہے تھے۔ برنالڈ لیوس استہزائی انداز میں لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ یقین کرنا بہت مشکل تھا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب حالات کو بدلنے میں مسلمانوں کی طاقت فیصلہ کن کردار ادا نہیں کر سکتی۔ اب ان کے دشمن عیسائیوں کے ہاتھ میں فیصلہ کن طاقت ہے اور مسلم حکومتوں کی زندگی کا انحصار بعض اوقات عیسائی حکمرانوں کی امداد اور بعض اوقات ان کی خوشنودی پر ہے۔[۳۴] اس صورتِ حال پر برنارڈ لیوس کس قدر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''آخرکار مسلمان یورپ کی طرف واپس جا رہے تھے۔ یہ واپسی تحسین وآفرین یا احترام کے ساتھ نہیں تھی کیونکہ خوف کا عنصر اس میں بہرحال شامل تھا، تاہم یورپ کی نقل کر کے بہرحال اسے خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا تھا اور یہ سلسلہ ہمارے زمانے تک جاری ہے۔''[۳۵]

مسلمان ہیں کہ گزشتہ پانچ چھ صدیوں سے شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر

اپنے باطن کے نہاں خانہ میں خلوت نشین ہوگئے ہیں۔ نوسٹلجیا میں مبتلا اس قوم کا سرمایۂ حیات اب ماضی کی یادیں ہیں اور اب حال یہ ہے کہ ''مستحب و مکروہ'' کی تخصیص کے بغیر ہماری تہذیب کے دروازے ہر اس شئے کے لیے بغیر امتیاز کے وا ہیں جو یورپ یا امریکہ سے آتی ہو۔

اب مسلمان فقط راکھ کا ڈھیر ہے۔ نہ وہ زمانہ ہے، نہ وہ زمانہ ساز لوگ۔ اب تو بقول میر حسن:

داغ ہیں کاروانِ رفتہ کے
نقش پائے گزشت گاں ہیں ہم لوگ

مسلمانوں میں بہت سی کمزوریاں ہیں۔ روحانی طور پر ان میں اسلامی تعلیمات کی تشریح پر اختلاف ہے۔ ان میں مذہبی قیادت کا فقدان ہے۔ قومی، نسلی، مذہبی فرقوں، لسانی، نسبی اور معاشی حیثیت کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور اکثر ایک دوسرے کی تباہی میں مدد دیتے ہیں۔ مذہبی رہنما اور فرقے، قرآن، حدیث اور شریعت کی تشریح و تعبیر میں ایک دوسرے کے مقابلے پر تلے رہتے ہیں اور اپنا نقطۂ نظر منوانے اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو رد کرنے کے لیے انتہائی حد تک جانے پر بھی آمادہ رہتے ہیں۔

مسلمانوں کے اختلافات کو نمایاں کرنے میں مغربی ذرائع ابلاغ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسلمانوں میں بعض تنازعات صدیوں پرانے ہیں۔ جدید مسلم ممالک میں داخلی شورش اور ہنگامہ آرائی اکثر اوقات تاریخی تعصبات اور تنازعات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ہر گروہ دوسرے تمام گروپوں کو گمراہ سمجھتا ہے، یہاں تک کہ ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔[۳۶] مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے مسلمانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے:

خانۂ ویران سازیِ حیرت، تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
(غالب)

مسلمانوں کو بہت سے اقتصادی مسائل کا سامنا ہے۔ بحیثیتِ عمومی وہ معاشی طور پر کمزور ہیں۔ انہیں کم فی کس آمدنی، وسیع البنیاد غربت، وسائل کی ناقص تقسیم، اونچے درجے کی ناخواندگی، ناقص تربیت یافتہ افرادی طاقت، وسیع پیمانے پر بے روزگاری، بدعنوانی، وسائل کے غلط استعمال اور غیر ملکی امداد پر حد سے زائد انحصار جیسے مسائل درپیش ہیں۔[۳۷]

مسلمان اپنی محرومیوں اور مایوسیوں کے اظہار کے لیے اپنی ذاتی یا قومی حیثیت میں دستیاب تھوڑی بہت طاقت کو بھی تشدد کی کارروائیوں میں استعمال کرنے پر مائل نظر آتے ہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ کے ذریعے تشدد کی ان ذاتی کارروائیوں کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے جیسے تمام مسلمان دُنیا کے موجودہ استحکام کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔[۳۸] دوسروں کی ترقی پر انہیں رشک نہیں آتا اور نہ اپنے تنزل پر انہیں ندامت ہوتی ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے اجداد اپنے حوصلے کی وجہ سے دُنیا میں نامدار تھے اور جن کے علم و فضل کا ہر طرف سکہ چلتا تھا۔ ان کی اولاد آج اسلام کو بدنام کر رہی ہے۔ وہ نہیں سوچتے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
(اقبال)

بساطِ عالم پر ایک ارب سے زائد مسلمان محض ایک منتشر بھیڑ ہیں کہ جن کی حیثیت سیلاب کے رُخ پر بہنے والے خس و خاشاک کی اور جن کے دلوں میں دُنیا کی محبت اور موت سے کراہت پائی جاتی ہو۔ ابو داؤد میں حضرت ثوبانؓ کے حوالے سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ تمہارے خلاف دُنیا کی قومیں ایک دوسرے کو اس طرح دعوت دیں گی جس طرح بھوکے اپنے خوان کی طرف دعوت دیتے ہیں۔'' ایک پوچھنے والے نے دریافت کیا: ''کیا یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اس زمانے میں ہم تعداد کے اعتبار سے کم ہوں گے؟'' فرمایا: ''نہیں، اُس زمانے میں تم بہت زیادہ ہوں گے، لیکن اُس زمانے میں تمہاری

حیثیت سیلاب کے رُخ پر بہنے والے خس و خاشاک کی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں سے تمہاری ہیبت نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری پیدا کر دے گا۔'' سوال کرنے والے نے دریافت کیا: ''کمزوری' کیا ہے؟'' ارشاد ہوا: ''دُنیا کی محبت اور موت سے کراہت و نفرت۔''

کیا اسلامی نشاۃِ ثانیہ ممکن ہے؟ اے سپرنگر (A. Sprinsger) کا خیال ہے کہ ایک صدی سے بھی کم زمانے میں اہلِ ایشیا مغربی تہذیب وتمدن پر اپنا اثر ڈالیں گے اور ذہنِ انسانی کی ترقی کو ایک غیر متوقع راہ پر لگائیں گے۔ وہ ایسی کتب تصنیف کریں گے جن سے نہ صرف انہیں بلکہ اہلِ یورپ کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ اہلِ مشرق ذہانت میں یورپین لوگوں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض لحاظ سے ان سے زیادہ تیز فہم ہیں۔ وہ مستقبل میں جو غالباً بہت دُور نہیں ہے، انسانیت کی ترقی کے پیش رَو بن جائیں گے۔ دوسری صدی عیسوی میں اور اس کے بعد بھی علوم وفنون کے چند بڑے بڑے محقق شام اور شمالی افریقہ کے لوگ تھے، اس کا مکرر اعادہ ہونا اچھی طرح ممکن ہے۔''[۳۹]

اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا موجودہ مرحلہ تقاضا کرتا ہے کہ مغربی نمونوں (Models) کی غلامانہ نقالی سے احتراز کیا جائے اور ایک چھان پھٹک والی بصیرت اختیار کی جائے کہ بیرونی تہذیب سے کیا لینا چاہیے اور کیا نہ لینا چاہیے۔

سائنسی تحقیقات کے معاملے میں جو غفلت مسلمانوں سے ماضی میں سرزد ہوئی ہے، اس کی تلافی مغربی علوم کی بے قید و بند قبولیت سے ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ ہماری تمام تر پس ماندگی اور افلاس کا اس مہلک اثر کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا جو مغربی علوم کی اندھی تقلید کے ہاتھوں دُنیائے اسلام کے مذہبی ممکنات پر پڑے گا۔ اگر ہم اسلام کی حقیقت و صداقت (Reality) کو ایک تہذیبی عامل کی حیثیت سے محفوظ و مصوّن رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مغرب کے ذہنی ماحول سے ہر وقت اور ہر آن چوکنا رہنا ہوگا۔[۴۰] وہ سب سے اہم چیز جس میں مغرب سے اخذ و استفادہ ملتِ اسلامیہ کے لیے منفعت بخش ہوسکتا ہے، وہ سائنسی علوم وفنون

اور ان کا منہاج و طریقِ کار (Scientific Matter and Method) ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مغرب کے علومِ قطعیہ (Exact Sciences) کا مطالعہ کرنے اور ان کو اخذ و قبول کرنے سے بالکل نہ ہچکچائیں۔ البتہ وہ مغربی فلسفہ و فکر کے کسی بھی جزو کو اخذ و جذب کرنے سے گریز کریں۔[۴۱] مغربی دُنیا سے سائنسی علوم کی طلب و جستجو دُنیائے اسلام کے لیے ایک ناگزیر صورت کا درجہ ہے تاہم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کسی مسلمان کا مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب سے برتر و فائق گردانا اور پھر اس کی تقلید و نقالی کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ مغرب کے ذہنی رویے کے آگے غلامانہ سرِ تسلیم خم کیے بغیر جدید سائنس کا سیکھنا اور سکھانا آج بھی ممکن ہے، البتہ اس کے لیے بے انتہا مجتہدانہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ مسلم سائنس دانوں کا فرض ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ سائنسی تفحص کے آخری کنارے پر پہنچ جائیں تو اس وقت مغرب کے فلسفیانہ نظریات سے دامن جھاڑ کر خود اپنے ہی یعنی اسلامی فکر و نظر سے ایسے نتائج استنباط کر جائیں جو مغربی سائنس دانوں کی اکثریت کے استنباط کردہ نتائج سے بالکل مختلف ہوں۔[۴۲] اسلام کی ضرورت ایسے قومی مفکرین ہیں جو عصرِ حاضر کے علوم اور ترقیات سے استفادہ کرتے ہوں اور قدیم متون اور روایات پر پھر سے نظر ڈال سکیں۔[۴۳]

حوالہ جات:

[۱] ڈاکٹر موسیولی بان، "Law Psychology Uisdel Evolution Despeuples"، اُردو ترجمہ بعنوان: قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ، مترجم: مولانا عبدالسلام ندوی، مشتاق بک کارنر، لاہور، سنِ اشاعت ندارد، ص ۱۷۵۔

[۲] ول ڈیورانٹ (Will Durant)، "The Lessons of History"، اُردو ترجمہ بعنوان: تاریخ کیا سکھاتی ہے، مترجم: ظفر الحسن پیرزادہ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۵۔

[۳] ڈاکٹر موسیولی بان، "Law Psychology Uisdel Evolution Despeuples"، محولہ بالا، ص ۱۷۷۔

[۴] سیّد امیر علی، Spirit of Islam، اُردو ترجمہ بعنوان: روحِ اسلام، مترجم: محمد ہادی حسین، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع نہم ۱۹۹۵ء، ص ۵۸۱۔

[۵] ایضاً، ص ۵۸۲-۵۸۳۔

[۶] ایضاً، ص ۵۸۴۔

[۷] ایضاً، ص ۵۸۴، ۵۸۵۔

[۸] ابنِ اثیر، الکامل، جلد ۱۳، ص ۲۰۲۔

[۹] ایضاً۔

[۱۰] کرسٹین پرائس، دی سٹوری آف مسلم آرٹ، اُردو ترجمہ بعنوان: اسلامی فنون کی داستان، مترجم: ہلال احمد زبیری، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، طبع اوّل ۱۹۶۸ء، ص ۶۵۔

[11] E.G. Browne, A Literary History of Persia, Vol 2, p. 440.

[۱۲] البدایہ والنہایہ، جلد ۱۳، ص ۳۴۰۔

[۱۳] مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، طبع پنجم ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۴۔

[۱۴] بحوالہ: مولانا وحید الدین خاں، فکرِ اسلامی، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۰۔

[۱۵] ڈاکٹر افضل اقبال، مولانا رومی، حیات و افکار، مترجم: بشیر محمود اختر، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۱ء، ص ۳، ۴۔

[۱۶] برنارڈ لیوس (Bernord Lewis)، The Muslim Discovery of Europe، اُردو ترجمہ بعنوان: یورپ مسلمانوں کی نظر میں، مترجم: مسعود اشعر، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۷۔

[۱۷] ایضاً، ص ۲۰۹۔

[۱۸] آرنلڈ جے۔ ٹائن بی، مطالعہ تاریخ (حصہ دوم) تلخیص: ڈی۔سی۔ سومرویل، ترجمہ: غلام رسول مہر، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۲۷۹، ۲۸۰۔

[۱۹] ایضاً، ص ۲۸۱۔

[۲۰] مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، محولہ بالا، ص ۲۲۹، ۲۳۰۔

[۲۱] مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج و زوال، ادارہ اسلامیات، لاہور، بار اوّل اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۴۔

[۲۲] ڈاکٹر محمد امین، اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۰، ۱۲۱۔

[۲۳] نجلا عز الدین/محمود حسین (مترجم)، عرب دُنیا، بحوالہ ''اقبال کا علمِ کلام''، از سیّد علی عباس جلالپوری۔

[۲۴] مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، محولہ بالا، ص ۲۲۸۔

[۲۵] اسلام والحضارۃ العربیہ، جلد۲، ص ۴۹۹۔

[۲۶] مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، محولہ بالا، ص ۲۳۱، ۲۳۲۔

[۲۷] برنارڈ لیوس (Bernord Lewis)، The Muslim Discovery of Europe، اُردو ترجمہ بعنوان: یورپ مسلمانوں کی نظر میں، محولہ بالا، ص ۳۵۔

[۲۸] ایضاً، ص ۳۹۔

[۲۹] مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، محولہ بالا، ص ۲۱۵۔

[۳۰] علی نواز میمن، ملتِ اسلامیہ، (مترجم: صفوت قدوائی)، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۲۷۔

[۳۱] ایضاً، ص ۲۸۔

[۳۲] ایضاً، ص ۲۹۔

[۳۳] آرنلڈ جے۔ ٹائن بی، مطالعۂ تاریخ (حصہ دوم)، محولہ بالا، ص ۲۹۳۔

[۳۴] برنارڈ لیوس (Bernord Lewis)، The Muslim Discovery of Europe، اُردو ترجمہ بعنوان: یورپ مسلمانوں کی نظر میں، محولہ بالا، ص ۳۹۔

[۳۵] ایضاً، ص ۳۳۳۔

[۳۶] علی نواز میمن، ملتِ اسلامیہ، ص ۸۳۔

[۳۷] ایضاً، ص ۱۰۵۔

[۳۸] ایضاً، ص ۱۶۸۔

[۳۹] مقالات گارساں دتاسی (۱۸۷۲ء)، جلد اوّل، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، طبع دوم ۱۹۶۴ء، ص ۲۴۳۔

[40] Muhammad Asad, Islam at the Cross Road, Lahore, Sh. Muhammad Ashraf, 6th Ed. 1975, p. 100.

[41] Ibid, p. 92, 93.

(42) Ibid p 93

[43] Fazlur Rehman, Islam and Modernity: Transformation of an Intellectual Tradition, Chicago, University of Chicago Press, 1982, p. 139.